

نیام نظام تعلیم

[یہ وہ خطبہ ہے جو ۵ جنوری ۱۹۴۱ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کی انجمن اتحاد طلبہ

کے سامنے میر "ترجمان القرآن" نے عرض کیا]

حضرات! خوش قسمتی سے آج مجھے اُس جگہ اپنے خیالات اظہار کا موقع مل رہا ہے جہاں موجود دور میں سب سے پہلے اسلامی نظام تعلیم کی اصلاح کا تجنیل پیدا ہوا اور سب سے پہلا قدم اسکی طرف اٹھایا گیا۔ اسی وجہ سے میں اس موقع کے لیے تعلیمی اصلاح ہی کے سوال کو اپنا موضوع بحث منتخب کیا ہے۔ میرے اس انتخاب میں ایک بڑا محرک یہ بھی ہے کہ اس وقت ہماری دینی درس گاہوں میں عموماً اصلاح تعلیم کے مسئلے پر گفتگو چھڑی ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ضرورت کا احساس تو پیدا ہو گیا ہے، مگر جس انداز سے یہ ساری گفتگو ہو رہی ہے اس سے صاف عیاں ہے کہ اصلاح کی خواہش کرنے والوں کے ذہن میں مسئلہ کی نوعیت کا کوئی واضح تصور نہیں ہے۔ لوگ اس گمان میں ہیں کہ پرانی تعلیم میں خرابی صرف اتنی ہی ہے کہ نصاب بہت پرانا ہو گیا ہے اور اس میں بعض علوم کا عنصر بعض علوم سے کم یا زیادہ ہے اور جدید زمانہ کے بعض ضروری علوم اس میں شامل نہیں ہیں۔ ایسے اصلاح کی ساری بحث صرف اس حد تک محدود رہ جاتی ہے کہ کچھ کتابوں کو نصاب خارج کر کے کچھ دوسری کتابوں کو داخل کر دیا جائے، عناصر تعلیمی کے تناسب میں ترمیم کر کے بعض اجزاء گھسائے اور بعض بڑھائے جائیں، اور قدیم علوم کے ساتھ تاریخ، جغرافیہ، معاشیات اور سیاسیات وغیرہ علوم کی بھی کچھ کتابیں طلبہ کو پڑھانی جائیں۔ ایسی ہی کچھ جزوی ترمیمات طرز تعلیم اور انتظام مدارس میں بھی تجویز کی جاتی ہیں۔ اور بہت زیادہ "روشن خیالی"

پر جو لوگ اتر آتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ صاحب ہر مولوی کو میٹرک تک انگریزی پڑھا کرنا لو تا کہ کم از کم تار پڑھنے اور لکھنے کے قابل تو ہو جائے۔ لیکن یہ جدت جو آج دکھائی جا رہی ہے، یہ اب بہت پرانی ہو چکی ہے۔ اسکی عمر اتنی ہے جتنی آپکے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی عمر ہے۔ اسکا زیادہ سے زیادہ فائدہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ پہلے سے کچھ زیادہ کامیاب قوم کے مولوی پیدا ہو جائیں جو کچھ جرمنی اور امریکہ کی باتیں بھی کرنے لگیں۔ اس ذرا سی اصلاح کا نتیجہ کبھی نہیں نکل سکتا کہ دنیا کی امامت و قیادت کی باگیں علماء اسلام کے ہاتھ میں آجائیں اور وہ دنیا جو آج آگ کی طرف چلانے والے امراء (Leaders) کے پیچھے چل رہی ہے، جنت کی طرف بلانے والے امراء کی رہبری قبول کرنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ نتیجہ اگر حاصل کرنا مقصود ہو تو آپ کو مکمل انقلابی اصلاحات کے لیے تیار ہونا پڑے گا اور اس سارے نظام تعلیم کو ادھیڑ کر از سر نو ایک دوسرا ہی نظام تعلیم بنانا ہوگا۔ اس صحبت میں اسی نئے نظام تعلیم کا نقشہ میں آپکے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

علم اور امامت کا رشتہ | سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ اس دنیا میں امامت و قیادت Leadership

کا مدار آخر ہے کس چیز پر؟ کیا چیز ہے جس کی بنا پر کبھی مصر امام بنتا ہے اور دنیا اسکے پیچھے چلتی ہے، کبھی بابل امام بنتا ہے اور دنیا اسکی پیروی کرتی ہے، کبھی یونان امام بنتا ہے اور دنیا اسکا اتباع کرتی ہے، کبھی اسلام قبول کرنے والی اقوام امام بنتی ہیں اور دنیا انکے نقش قدم پر چلتی ہے، اور کبھی یورپ امام بنتا ہے اور دنیا اسکی تابع بن جاتی ہے؟ پھر وہ کیا چیز ہے جسکی وجہ سے امامت آج ایک کو ملتی ہے، اکل اس سے چم کر دوسرے کی طرف چلی جاتی ہے، اور پرسوں اُس سے بھی سلب ہو کر دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتی ہے؟ کیا یہ محض ایک بے ضابطہ اتفاقی امر ہے یا اس کا کوئی ضابطہ اور اصل مقرر بھی ہے؟ اس سلسلہ پر جتنا زیادہ غور کیا جائے اس کا جواب یہی ملتا ہے کہ ہاں اس کا ضابطہ ہے، اور وہ ضابطہ یہ ہے کہ امامت کا دار من ہمیشہ علم سے وابستہ رہے گا۔ انسان کو بحیثیت ایک نوع کے زمین کی خلافت ملی ہی علم کی وجہ سے ہے۔ اس کو سمیع، بصر، اور فوؤد اتین چیزیں ایسی دی گئیں جو دوسری مخلوقات ارضی کو یا تو نہیں دی گئیں یا اسکی بہ نسبت کم تر

دی گئی ہیں۔ اسیلئے وہ اس بات کا اہل ہو کہ دوسری مخلوقات پر خداوندِ عالم کا خلیفہ بنا یا جائے۔ انہی کو اس نوع میں سے جو طبقہ یا گروہ علم کی صفت میں دوسرے طبقوں اور گروہوں سے آگے بڑھ جائیگا وہ اسی طرح ان سب کا امام بننے کا اہل ہوگا جس طرح انسان من حیث النوع دوسری انواع ارضی پر اسی چیز کی وجہ سے خلیفہ بننے کا اہل ہوا ہے۔

تقسیم امامت کا ضابطہ اس جواب سے خود بخود دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ علم سے مراد کیا ہے؟ اور اُس میں آگے بڑھنے اور پیچھے رہ جانے کا مفہوم کیا ہے؟ اس مسئلہ کا حل سمع، بصر اور فؤاد ہی کے الفاظ میں پوشیدہ ہے۔ کلام الہی میں یہ تینوں لفظ مجرد معنی، دیکھنے اور سوچنے کے معنی میں استعمال نہیں ہوئے ہیں، بلکہ سمع سے مراد دوسروں کی فراہم کی ہوئی معلومات حاصل کرنا ہے، بصر سے مراد خود مشاہدہ کر کے واقفیت بہم پہنچانا ہے، اور فؤاد سے مراد ان دونوں ذرائع سے حاصل کردہ معلومات کو مرتب کرنا اور نتائج اخذ کرنا ہے۔ یہی تین چیزیں مل کر وہ علم بنتا ہے جسکی قابلیت انسان کو دی گئی ہے۔ برسبیل اطلاق اگر دیکھا جائے تو تمام انسان ان تینوں قوتوں سے کام لے رہے ہیں اور اسی وجہ سے مخلوقات ارضی پر خلیفانہ تسلط ہر انسان کو حاصل ہے۔ ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ دیکھیے گا تو معلوم ہوگا کہ جو انسان انفرادی طور پر، اور جو انسانی گروہ اجتماعی طور پر ان تینوں قوتوں سے کم کام لیتے ہیں وہ ہست اور مغلوب رہتے ہیں، انہیں تابع اور مطیع بن کر رہنا پڑتا ہے، ان کا کام پیچھے ہی چلنا ہوتا ہے۔ بخلاف اسکے جو ان تینوں سے زیادہ کام لیتے ہیں وہ برتر و غالب ہوتے ہیں، متبوع اور مطاع بنتے ہیں، رہنمائی و پیشوائی انہی کے حصہ میں آتی ہے۔ مگر امامت لینے اور چھیننے کا ضابطہ معلوم کرنے کے لیے آپ کو اس سے بھی زیادہ تفصیلی نگاہ ڈالنی ہوگی۔ اس تفصیلی نگاہ میں آپ کو یہ حقیقت نظر آئے گی کہ ایک گروہ تمام انسانوں کا امام اُس وقت بنتا ہے جب وہ ایک طرف اُن معلومات کا زیادہ سے زیادہ حصہ جمع کرتا ہے جو باطنی اور حال کے انسانوں سے حاصل ہو سکتی ہیں، دوسری

طرف خود اپنے مشاہدہ سے مزید معلومات فراہم کرنے میں لگا رہتا ہے، تیسری طرف ان دونوں قسم کی معلومات کو مرتب کر کے نتائج اخذ کرتا ہے اور پھر ان نتائج سے کام لیتا ہے، پہلے کی جو چیزیں غلط کم از کم اسکے اخذ کردہ نتائج کے لحاظ سے غلط۔ ثابت ہوتی ہیں انکی اصلاح کرتا ہے، پہلے کی جن چیزوں کا نقص۔ کم از کم اس کے فہم کے لحاظ سے۔ اس پر کھلتا ہے انکی تکمیل کرتا ہے، اور جو نئی چیزیں علم میں آتی ہیں ان سے اپنی حدود تک زیادہ سے زیادہ کام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ صفات جب تک اُس گروہ میں تمام دوسرے انسانی گروہوں سے زیادہ رہتی ہیں، وہی پوری نوع کا امام ہوتا ہے اور جو ان صفات کے اعتبار سے کم تر ہوتے ہیں ان کے لیے اللہ کی امت تقدیر یہ ہے کہ وہ اسکی اطاعت بھی کریں اور اتباع بھی۔ اگر قسمت کی یادری نے اطاعت بجا بھی لیا تو انکے لیے اتباع سے تو کوئی مفرت نہیں ہوتا، خواہ جان بوجھ کر بالارادہ کریں، خواہ بے جا نے بوجھے اضطراب کریں۔ اس دور عروج کے بعد جب اس گروہ کے زوال کا وقت آتا ہے تو وہ تھک کر اور اپنے کیے ہوئے کام کو کافی سمجھ کر مشاہدہ سے مزید معلومات حاصل کرنے اور فوائد سے مزید نتائج اخذ کرنے کی کوشش چھوڑ دیتا ہے، اور اس کا تمام سرمایہ علمی صرف سمع سے حاصل شدہ معلومات تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب اسکے لیے علم کے معنی صرف یہ جاننے کے ہو جاتے ہیں کہ پہلے جو معلومات حاصل کی گئی تھیں اور ان سے جو نتائج اخذ کیے گئے تھے وہ کیا تھے۔ اب وہ اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ جو علم پہلے حاصل کیا جا چکا ہے وہ کافی ہے، اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں، پہلے جو نتائج اخذ کیے جا چکے ہیں وہ صحیح ہیں، ان میں کسی اصلاح و ترقی کا موقع نہیں، پہلے جتنی تعمیر ہو چکی ہے وہ مکمل ہے، نہ اس میں ترمیم ہی کی جاسکتی ہے اور نہ اس کے آگے مزید تعمیر ہی ممکن ہے۔ اس مرحلہ پر پہنچ کر یہ گروہ خود امامت سے ہٹ جاتا ہے اور نہ ہٹنا چاہے تو زبردستی ہٹا دیا جاتا ہے۔ پھر جو دوسرا گروہ مزید اکتساب علم، مزید اخذ نتائج، اور مزید تعمیر حیات کا عزم لیکر آگے بڑھتا ہے امامت و قیادت اس کا حصہ ہوتی ہے، اور وہ صاحب جو پہلے امام تھے اب مقتدی بنتے

ہیں، جو پہلے مطاع و مقبول تھے، اب مطیع و تابع بنتے ہیں، جو پہلے جیتے جاگتے ظلم کے مالک اور دنیا کے استاد بنے ہوئے تھے، اب عجائب خانہ آثار قدیمہ میں بھج دیے جاتے ہیں تاکہ بیٹھے علوم ادواہل کی تشریح کرتے رہیں۔

موجودہ اسلامی نظام تعلیم کا بنیادی نقص | اس مختصر بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امامت، خواہ وہ آگ کی طرف لیجانے والی ہو یا جنت کی طرف، بہر حال اُس گروہ کا حصہ ہے جو سمع و بصر و قواد کو تمام انسانی گروہوں سے بڑھ کر استعمال کرے۔ یہ انسان کے حق میں اللہ کا بنایا ہوا اہل ضابطہ ہے اور اس میں کوئی رورعایت نہیں ہے۔ کوئی گروہ خواہ خدا شناس ہو یا ناخدا شناس، بہر حال وہ یہ شرط پوری کرے گا تو دنیا کا امام بن جائیگا اور نہ کریگا تو مقتدی ہی نہیں بلکہ اکثر حالات میں مطیع بھی بننے سے نہ بچ سکیگا۔ آپکو جس چیز نے امامت کے منصب سے ہٹایا اور ناخدا شناس اہل مغرب کو اس پر لایا وہ دراصل یہی ضابطہ ہے۔ آپکے ہاں مدتہائے دراز سے علم کی جو حالت تھی اُس میں بصر اور قواد دونوں معطل تھے، اور سمع کا کام بھی صرف پہلے کی حاصل شدہ معلومات فراہم کرنے تک محدود تھا۔ بخلاف اسکے ناخدا شناس یورپ علم کے میدان میں آگے بڑھا اور اس نے سمع سے بھی آپ سے بڑھ کر کام لیا اور بصر و قواد کا کام تو کھپٹی ٹھانی تین صدیوں میں تمام تر اسی نے انجام دیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا اور یہی ہوا کہ وہ امام بن گیا اور آپ مقتدی بن کر رہ گئے۔ آپکی دینی تعلیم کے تمام مرکز ابھی تک اپنی اسی غلطی پر اڑے ہوئے ہیں جس نے آپ کو اس درجہ پر پہنچایا ہے۔ ان کے ہاں علم محض علوم ادواہل کے پڑھنے پڑھانے تک محدود ہے۔ ندوہ اور انہر نے اصلاح کی طرف ایک قدم بڑھایا، مگر اس کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ سمع کا دائرہ حال کی معلومات تک بڑھا دیا جائے۔ بصر اور قواد پھر بھی معطل کے معطل ہی رہے۔ اس علم کا فائدہ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ آپ گھٹیا قسم نہ سہی بڑھیا قسم مقتدی بن جائیں۔ امامت بہر حال آپ کو نہیں مل سکتی۔ اس وقت تک جتنی اصلاحی تجویزیں میری نظر سے گذری ہیں وہ سب کی سب بہتر

مقتدی ہی بنانے والی ہیں۔ امام بنانے والی کوئی تجویز ابھی تک نہیں سوچی گئی حالانکہ دنیا کی واحد خدا شناس جماعت ہونے کی حیثیت سے جو فرض آپ کے ذمہ عائد ہوتا ہے اسکو آپ انجام نہیں دے سکتے جب تک کہ آپ ناخدا شناس لوگوں سے دنیا کی امامت کا منصب چھین کر خود اس پر قبضہ نہ کریں۔ اور اسکی کوئی صورت اسکے سوا نہیں ہے کہ آپ مجرّد سمعی علم پر قناعت کا خیال چھوڑیں اور بصرفِ قواد سے نہ صرف کام لیں بلکہ اس میں دنیا کے تمام گروہوں پر فوق لے جائیں۔

کس قسم کی اصلاح درکار ہے | یہ جو میں عرض کیا کہ ”دنیا کی واحد شناس جماعت ہونے کی حیثیت سے آپ پر جو فرض عائد ہوتا ہے اسکو آپ انجام نہیں دے سکتے جب تک کام نہ کریں“۔ یہ دراصل میری اس تمام بحث کا مرکزی نکتہ ہے اسلئے میں اسکی مزید تشریح کرونگا۔ اگر محض ایک انسانی گروہ ہونے کی حیثیت سے مطلقاً امام بننے کا سوال ہو تب تو آپکو کسی اصلاح تعلیم یا تجدید نظام تعلیمی کی ضرورت نہیں۔ سیدھا راستہ کھلا ہوا ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی، مایامصر و ایران و ترکی کی سرکاری یونیورسٹیوں کے طرز پر تعلیم کے میدان میں پیش قدمی فرمائیے اور اسی قسم کی امامت کے لیے امیدوار بن جائیے جیسی اس وقت یورپ اور امریکہ کو حاصل ہے اور جسکے لیے اب جاپان مسابقت کر رہا ہے۔ مگر خدا شناس گروہ ہونے کی حیثیت سے آپکی یہ پوزیشن نہیں ہے۔ آپکی یہ پوزیشن ہرگز نہیں ہے کہ آپ محض اپنے لیے امامت چاہتے ہوں خواہ وہ امامت داعیہ الی انار ہو یا داعیہ الی الجنت۔ یورپ سے آپکا جھگڑا اس بنا پر نہیں ہے کہ دنیا کا امام نہ رہے، اسکی جگہ آپ ہو جائیں۔ بلکہ اس سے آپکا جھگڑا اصول اور مقصد کا جھگڑا ہے۔ وہ ناخدا شناس بلکہ خدا سے بغاوت اور طغیان کی بنا پر دنیا کی امامت کر رہا ہے اور آگ کی طرف ساری دنیا کو لیجا رہا ہے۔ بخلاف اسکے آپنا شناس گروہ انسانی ہیں۔ خدا کی اطاعت پر آپکے مسلک کی بنیاد ہے۔ آپکے ایمان کی رو سے آپ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ نہ صرف خود آگ کے راستہ سے بچ کر جنت کے راستہ پر جائیں بلکہ دنیا کو بھی اسی راستہ پر چلائیں۔ اور یہ فرض آپ انجام نہیں دے سکتے جب تک کہ آپ اُس سے

امامت چھین کر خود امام نہ بنیں۔ یہاں سوال نسلی یا جغرافیائی نہیں، خالص اصولی ہے۔ ناخدا شناسی کی امامت اگر ترک، یا ایرانی یا مصری یا ہندوستانی کی ہو تو وہ بھی اسی طرح مٹا دینے کے قابل ہے جس طرح فرنگی یا جاپانی کی۔ اور خدا شناسی کی بنیاد پر جو امامت ہو وہی مطلوب ہے، خواہ اسکے علمبردار ہند ہوں یا فرنگی یا کوئی اور۔

ناخدا شناس امامت کے نتائج [کسی امام داعی الی النار یا داعی الی الجنتہ ہونے کا مدار بالکل اسکے خدا شناس یا ناخدا شناس ہونے پر ہے۔ جب کوئی ایسا گروہ جو خدا شناس نہ ہو اپنے علمی اجتہاد کی بدولت دنیا کا امام بن جاتا ہے، تو وہ تمام سمعی و بصری معلومات کو اس نقطہ نظر سے جمع کرتا ہے اور اسی نقطہ نظر کے مطابق مرتب کرتا ہے کہ اس کائنات کا کوئی خدا نہیں ہے، انسان محض ایک غیر مسئول (Irresponsible) ہستی ہے۔ دنیا کی جو چیزیں اسکے لیے مسخر ہیں وہ سب اسکی ملک ہیں جن سے کام لینے کا مقصد اور طریقہ متعین کرنے میں وہ مختار محض ہے، اور اسکی تمام سعی و جہد کا مقصد اس کے مقصود اسکے سوا کچھ نہیں کہ اپنی خواہشات نفس کی خدمت کرے۔ معلومات کے اس اساس پر مرتب ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکمت نظری اور حکمت عملی دونوں کا نشوونما خدا پرستی کی بالکل مخالف سمت میں ہوتا ہے، یہی حکمت تمام دنیا کے قلوب اذعان پر چھا جاتی ہے، اسی سے خالص مادہ پرستانہ اخلاقیات پیدا ہوتے ہیں، اسی پر انسان اور انسان کے درمیان تعلق کے تمام ضابطے بنتے ہیں، اسی کے مطابق انسان اپنی حاصل شدہ قوتوں کا مصرف معین کرتا ہے، اور فی الجملہ ساری انسانی زندگی کا بہاؤ اس راستہ کی طرف چل پڑتا ہے جسکی آخری منزلوں پر پہنچ کر اس دنیا ہی سے عذاب جہنم کی ابتدا ہوجاتی ہے جیسا کہ آج اپنے آپ کو دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ناخدا شناس حکمت جب تک دنیا کے افکار و اخلاقی تمدن اہر چیز پر چھائی رہتی ہے، خدا شناسی کے نقطہ نظر اور اس اخلاق و تمدن کے لیے جو اس نقطہ نظر پر مبنی ہو زمین و آسمان کے درمیان کوئی جگہ نہیں رہتی۔ لوگوں کے سوچنے کا انداز اس کے خلاف ہوتا ہے، طابع

کی افتاد اور مزاجوں کی پسند اسکے خلاف ہوتی ہے، انسانی معلومات کی بگڑی ہوئی ترتیب اسکے خلاف شہادت دیتی ہے، اخلاق کے سارے اصول اور قدر و قیمت کے سارے معیار اُس سے منحرف ہو جاتے ہیں، زندگی کے تمام ضابطے اور انسانی سعی و عمل کے سارے ہنگامے اسکو اپنے درمیان جگہ دینے سے انکار کر دیتے ہیں، اور اس صورت حال میں صرف یہی نہیں ہوتا کہ خدا پرستی کے مسلک کی ہر چیز دنیا میں نامقبول و نامعقول ہو کر رہ جاتی ہے، بلکہ خود وہ لوگ جو اس مسلک کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں فی الواقع اسکی پیروی کر نہیں سکتے، زندگی کے دریا کا بہاؤ زبردستی کھینچ کر ان کو اپنے راستے پر لے جاتا ہے، اور اسکے خلاف زیادہ سے زیادہ کشمکش وہ بس اتنی ہی کر سکتے ہیں کہ سر کے بل بہنے کے بجائے احتیاجاً پاؤں کے بل بہیں۔

جو گروہ خیالات کے میدان میں امام بنتا ہے، اور جو کائنات فطرت کی طاقتوں کو اپنے علم سے مسخر کر کے ان کے کام لیتا ہے اسکی امامت صرف خیالات ہی کے عالم تک محدود نہیں رہتی بلکہ زندگی کے پورے دائرے پر چھا جاتی ہے۔ زمین پر اسکا تسلط ہوتا ہے۔ رزق کی کنجیاں اُسکے قبضہ میں ہوتی ہیں۔ حاکمانہ اختیارات اسے حاصل ہوتے ہیں۔ سبیلے انسانی حیات اجتماعی کا سازا کار و بار اُس ڈھنگ اور اُس نقشے پر چلنے لگتا ہے جس کو وہ گروہ اپنی ذہنیت اور اپنے زاویہ نظر کے مطابق اسے چلانا چاہتا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ گروہ جسکو یہ تسلط دنیا اور اسکے معاملات پر حاصل ہے، خدا سے پھرا ہوا ہو، تو اُسکے حیثہ اقتدار میں رہتے ہوئے کوئی ایسا گروہ پنپ نہیں سکتا جو خدا کی طرف پھرنا چاہتا ہو جس گڑی میں آپ بیٹھے ہوئے ہوں اگر اُس کا ڈرائیور اسے کلکتہ کی طرف لیجا رہا ہو تو آپ کراچی کی طرف جا ہی سکتے ہیں۔ چارو ناچار آپکو اسی طرف جانا پڑے گا جہر ڈرائیور جانا چاہتا ہے۔ آپ بہت بگڑینگے تو اتنا کرینگے کہ اسی گڑی میں بیٹھے ہوئے اپنا رخ کلکتہ سے کراچی کی طرف پھیر لیں، اور برضا و رغبت نہ سہی کشاں کشاں اُس منزل پر جا پہنچیں جو آپ کی منزل مقصود کے عین مخالف سمت میں واقع ہے۔

موجودہ صورت حال | یہی صورت حال اس وقت فی الواقع درپیش ہے۔ آپکے امامت سے ہٹنے کے بعد جب

یورپ نے علم کے میدان میں پیش قدمی کی تو ناگزیر اسباب اسکی نگاہ کا زاویہ خدا سے بیزاری (Theophobia)

کی طرف پھیر دیا۔ اسی نقطہ نظر سے اس نے تمام سمعی معلومات کو جمع کیا، اسی نقطہ نظر سے اس نے آثار کائنات

کا مشاہدہ کیا، اسی نقطہ نظر سے اس نے معلومات کو مرتب کر کے نتائج اخذ کیے، اسی نقطہ نظر سے اس نے زندگی

کے مقاصد، اخلاق کے اصول، تمدن کے ضوابط، اور انفرادی اجتماعی برتاؤ کے ڈھنگ متعین کیے، اور اسی

نقطہ نظر سے اس نے تمام قوتوں کے معرف تجویر کیے جو اسے تحقیق و اجتہاد کی بدولت حاصل ہوئی تھیں۔

پھر جب اس علم کے زور پر وہ اتھا تو ایک طرف زمینیں کی زمینیں اور قومیں کی قومیں اسکے آگے مسخر ہو

چلی گئیں، اور دوسری طرف وہی علم، وہی ذہنیت، وہی مقاصد و غایات، وہی فکری ساخت، وہی اخلاقی

روش، وہی تمدنی قواعد و ضوابط، غرض وہی سب کچھ جو اس امام غالب کے پاس تھا، تمام دنیا پر چھا گیا۔

اب حال یہ ہے کہ ایک بچہ جسے ہوش سنبھالتا ہے اسی وقت سے اسکے ذہن اور اسکی زندگی کی تعمیر اس نقشہ

پر ہونے لگتی ہے جو یورپ کی امامت میں بنا ہے۔ سمعی معلومات اسی ترتیب سے اسکے دماغ میں اترتی ہیں،

مشاہدہ کے لیے وہی نقطہ نظر سے ملتا ہے، نتائج اخذ کرنے کی ساری تربیت اسی طرز پر اسے حاصل

ہوتی ہے، حق اور باطل، صحیح اور غلط، مقبول اور مردود کی تعیین کے لیے بھی معیار اُسے میسر آتا ہے، اخلاق

کے ہمہ اصول، زندگی کے وہی مقاصد اور سعی و عمل کے وہی راستے اُسکے سامنے روشن ہوتے ہیں، اپنے

گرد و پیش زندگی کا سارا کارخانہ اسی ڈھنگ پر اسے چلتا ہوا ملتا ہے، اور جب وہ اس طرح پروان چڑھتا

کے بعد خود کار گاہ حیات میں حصہ لینے کے لیے تیار ہوتا ہے تو چونکہ یہی ایک شین دنیا میں چل رہی ہے اور

کوئی دوسری شین چلنے والی موجود نہیں ہے، ایسے اسی کا پرزہ اسکو بن جانا پڑتا ہے۔ ناخدا شناس

تہذیب تمدن کے اس کامل تسلط میں اول تو یہی سخت مشکل ہے کہ خدا پرستانہ نظریہ حیات، مقصد زندگی

اور اصول اخلاق کو دونوں اور دماغوں میں راہ مل سکے، کیونکہ علوم و فنون کی ساری ترتیب اور زندگی

کی پوری روش اس کے بالکل برعکس سمت میں پھری ہوئی ہے لیکن لگنے لگے لوگ ایسے نکل بھی آئیں جنکے ذہن میں یہ تخم بڑھ کر پڑے تب بھی گرد و پیش کی پوری فضا اسکو غذا دینے سے انکار کر دیتی ہے۔ اسکو نہ کہیں علوم سے تائید ملتی ہے، نہ زندگی کے بنے اور جمے ہوئے نقشے اسکا ساتھ دیتے ہیں، نہ دنیا کے چلتے ہوئے معاملات ہی میں کہیں اسکی جگہ نظر آتی ہے۔ جس قدر معلومات گزشتہ پانسو برس کی مدت میں انسان کو حاصل ہوئی ہیں انکو مرتب کرنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے کا سارا کام ناخدا شناس لوگوں نے کیا ہے۔ خدا پرستی کے نقطہ نظر سے انکی ترتیب کا اور اخذ نتائج کا کوئی کام ہو ہی نہیں۔ فطرت کی جو طاقتیں اس دوران میں انسان کے لیے سخر ہوئیں اور قوانین طبیعی کی مزید دریافت سے جو فوائد حاصل ہوئے ان سے بھی خدا پرستوں نے نہیں بلکہ خدا کے باغیوں نے کام لیا اسیلئے ناگزیر تھا کہ تمدن انسانی میں ان سب کا مصرف وہی مقرر ہوتا جو انکے مقاصد زندگی اور اصول اخلاقی کے مناسب حال تھا۔ اسی طرح اجتماعی معاملات کی تنظیم کے جتنے نظری خاکے اور عملی طریقے اس دوران میں سوئے اور عملاً چلائے گئے ان سب کے سوچنے اور چلانے والے وہ دماغ اور وہ ہاتھ نہ تھے جن پر خدا پرستی کا مسلک فرمانروا ہوتا، بلکہ وہ تھے جو خدا کی اطاعت سے مخوف تھے، اسیلئے نظریات اور عملیات کے میدان پر آج سارے کے سارے وہی نقشے چھا ہوئے ہیں جو انہوں نے بنائے ہیں، اور ایسا کوئی نقشہ جو خدا پرستانہ مسلک کی بنیاد پر بنا ہوا، عملاً تو کیا موجود ہوتا نظر یہ کی شکل میں بھی ایسی تفصیلی ترتیب کے ساتھ مرتب نہیں ہے جو آج کے حالات سے ربط رکھتا ہو اور جس میں آج کے مسائل حیات کا پورا پورا حل مل سکے۔ اب اگر اس مسلک پر اعتقاد رکھنے والا کوئی شخص راہب بن کر دنیا اور اسکی زندگی سے الگ تھلگ کسی گوشے میں جا بیٹھے اور پانسو برس پہلے کی فضا اپنے اوپر طاری کر لے تب تو بات دوسری ہے، اور نہ اس دنیا کے معاملات میں ایک زندہ انسان کی حیثیت سے حصہ لینے کی صورت میں تو قدم قدم پر اسکے لیے مشکلات ہی مشکلات ہیں۔ اپنے مسلک میں نیک نیت اور صحیح الاعتقاد ہونے کے باوجود بار بار وہ نادانستہ ان فکری اور عملی راہوں پر چل پڑتا ہے، اور بار بار اسے مجبوراً ان راہوں پر چلنا پڑتا ہے۔

جو اسکے مسلک سے بالکل مختلف ہیں۔ نئی معلومات جب اسکے سامنے آتی ہیں تو اسکے لیے سخت دشوار ہوتا ہے کہ حقائق (facts) کو ان ناخدا شناس لوگوں کے نقطہ نظر اور اخذ کردہ نتائج سے الگ کر سکے۔ جنہوں نے انکی دریافت، ترتیب اور استخراج کا سارا کام انجام دیا ہے، ایسے اکثر وہ اس طرح حقائق کے ساتھ ساتھ انکے نظریات اور نتائج کو بھی مضموم کر جاتا ہے کہ اسے اس امر کا شعور تک نہیں ہوتا کہ امرت کے ساتھ کتنا زہر اسکے اندر اتر گیا۔ اسی طرح زندگی کے عملی معاملات کے جب اسکو واسطہ پیش آتا ہے تو وہ سخت مشکل میں پڑ جاتا ہے کہ کونسی راہ اختیار کرے۔ بہت اجتماعی نظریات جو فی الاصل اسکے مسلک کے خلاف ہیں، اسکے دل و دماغ پر زبردستی چھا جاتے ہیں، کیونکہ دنیا میں ہر طرف چلن ہی ان کا ہے، بہت سے عملی طریقوں کو غلط سمجھنے کے باوجود محض اس بنا پر وہ اختیار کرتا ہے کہ ان سے بہت کر وہ کوئی دوسری راہ سوچ نہیں سکتا۔ اور بہت سی غلط راہوں پر اسے مجبوراً اس لیے چلنا پڑتا ہے کہ ان پر چلے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے۔

انقلابِ امامت کے لیے حضرات! یہ ہے وہ صورتِ حال جس میں اس وقت آپ مبتلا ہیں۔ میں نے انقلابِ تعلیم ناگزیر ہے اس صورتِ حال کا جو تجزیہ کیا ہے، اگر اس میں کوئی غلطی آپ پاتے ہوں تو براہِ کرم مجھے بھی اس کا گاہ فرمائیں تاکہ میں اس پر نظر ثانی کر سکوں۔ لیکن اگر یہ تجزیہ صحیح ہے تو اسے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:

اولاً، ناخدا شناس ائمہ کی امامت میں رہ کر خدا شناسی و خدا پرستی کا مسلک زندہ نہیں رہ سکتا لہذا جو کوئی اس مسلک پر اعتقاد رکھتا ہو اسکے عین ایمان و اعتقاد کا اقتضا یہ ہے کہ اس امامت کو مٹانے اور خدا شناس امامت کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

ثانیاً، جو نظامِ تعلیم محض پرانے سمعی علوم کی حد تک محدود ہے اس میں یہ طاقت ہرگز نہیں ہے کہ امامت میں اتنا بڑا انقلاب کرنے کے لیے آپکو تیار کر سکے۔ لہذا اگر آپ اس پر راضی ہوں کہ خدا پرستی

کا مسلک بتدریج مٹتے مٹتے دنیا سے فنا ہو جائے تب تو شوق سے اسی نظام تعلیم پر جھے رہیں، ورنہ اسے آپ کو بدلنا ہوگا۔

مثلاً، جو نظام تعلیم تمام علوم کو اسی ترتیب اور اسی زاویہ نظر سے لیتا ہے جو ناخدا شناس انہ کی ترتیب اور اُن کا زاویہ نظر ہے، اور جو اُس تمدنی مشین کا پرزہ بننے کے لیے انسانی کو تیار کرتا ہے جو ان ائمہ ضلال نے بنائی ہے، وہ دراصل ارتداد کا مجرب نسخہ ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی فریب نہیں ہو سکتا کہ اس نوعیت کی کسی تعلیم گاہ پر مسلم یونیورسٹی، یا اسلامیہ کالج، یا اسلامیہ ہائی اسکول کے افغان کا اطلاق کیا جائے۔ اور اس تعلیم کے ساتھ دینیات کے کسی کورس کو الگ سے لاکر جوڑ دینا ۹۵ فی صدی تو بالکل ہی لا حاصل ہے، اور ۵ فی صدی فائدہ اگر اس سے حاصل ہو بھی سکتا ہے تو وہ بیش ازین نسبت کہ لوگ کچھ مدت تک کفر کے راستہ پر خدا کا نام لیتے ہوئے چلتے رہیں۔

رابعاً اصلاح تعلیم کا یہ لائحہ کہ علوم اسلامی کے ساتھ نئے علوم کا جوڑ لگایا جائے، یہ بھی اہمیت میں انقلاب کرنے کے لیے آپ کو تیار نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ فلسفہ، سائنس، تاریخ، سیاسیات، معاشیات اور دوسرے علوم جو اس وقت مدون و مرتب صورت میں آپ کو ملتے ہیں وہ سب کے سب ناخدا شناس لوگوں کی فکر و تحقیق کا نتیجہ ہیں اور انکی ترتیب و تدوین میں اس گروہ کا نقطہ نظر اس طرح پیوست ہے کہ حقائق و اقصیہ کو نظریات اور اوہام و تعصبات اور احوال و رجحانات سے الگ چھانٹ لینا اور خدا پرستی کے نقطہ نظر سے اُن کو بطور خود مرتب کر کے دوسرے نظریات قائم کرنا نہ ہر طالب علم کے بس کی بات ہے نہ ہر استاد کے بس کی۔ اب اگر آپ ایک طرف پرانے علوم کو پرانی ترتیب کے ساتھ، اور نئے علوم کو اس خاص ترتیب کے ساتھ جو اس وقت پائی جاتی ہے، ملا کر پڑھائینگے تو ان دو متضاد طاقتوں کے میل سے عجیب عجیب قسم کے مرکبات پیدا ہونگے۔ کوئی پرانے علوم سے مغلوب ہوگا تو مولوی بن جائیگا۔ کوئی نئے علوم سے مفتوح ہوگا تو مسٹریت کی طرف چلائیگا بلکہ کامریڈیت تک جا پہنچے گا۔ کوئی دونوں کے

درمیان مذہب ہو کر مضحل ہو جائیگا۔ بہت ہی کم آدمی اس نظامِ تعلیمی سے ایسے نکل سکتے ہیں جو دونوں قسم کے علوم کو جوڑ کر کوئی صحیح مرکب بنا سکیں، اور ان کا بھی اس قدر طاقتور ہونا بہت مشکل ہے کہ اٹھ کر خیالات اور زندگی کے دھارے کو ایک طرف سے دوسری طرف پھیر دیں۔

یہ نتائج جو میں نے حالات کے تجزیہ سے اخذ کیے ہیں اگر ان میں کوئی غلطی ہو تو میں پھر عرض کرتا ہوں کہ آپ مجھے اس سے آگاہ فرمائیں۔ لیکن اگر ان نتائج کو بھی آپ تسلیم کرتے ہیں، تو اب میں کہتا ہوں کہ امامت میں انقلاب کرنے کی اسکے سوا کوئی صورت نہیں کہ ان تینوں نظاماتِ تعلیمی سے ہٹ کر ایک بالکل نیا نظامِ تعلیم بنایا جائے جس کا نقشہ ابتدائی تعلیم سے لیکر انتہائی مدارج تک تینوں کے مختلف ہو۔

نئے نظامِ تعلیم کا خاکہ

اس انقلابی اصلاح کی ضرورت ثابت کرنے کے بعد میں اُس نظام کی تعمیر کا ایک خاکہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں:

پہلی خصوصیت سب سے پہلی چیز جو اس نئے نظام میں ہونی چاہیے، وہ یہ ہے کہ دینی اور دنیوی علوم کی انفرادیت مٹا کر دونوں کو اس میں یکجان کر دیا جائے۔ علوم کو دینی اور دنیوی، دو الگ الگ قسموں میں منقسم کرنا دراصل دین اور دنیا کی علیحدگی کے تصور پر مبنی ہے، اور یہ تصور بنیادی طور پر غیر اسلامی ہے۔ اسلام جس چیز کو دین کہتا ہے وہ دنیا سے الگ کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ دنیا کو اس نقطہ نظر سے دیکھنا کہ یہ اللہ کی سلطنت ہے، اور اپنے آپ کو یہ سمجھنا کہ ہم اللہ کی رعیت ہیں، اور دنیوی زندگی میں ہر طرح سے وہ رویہ اختیار کرنا جو اللہ کی رضا اور اسکی ہدایت کے مطابق ہو، اسی چیز کا نام دین ہے۔ اس تصور دین کا اقتضار یہ ہے کہ تمام دنیوی علوم کو دینی علوم بنا دیا جائے۔ ورنہ اگر کچھ علوم دنیوی ہوں اور وہ خدا پرستی کے نقطہ نظر سے خالی رہیں، اور کچھ دوسرے علوم دینی ہوں اور وہ دنیوی علوم سے الگ پڑھائے جائیں، تو ایک بچہ شروع ہی سے اس ذہنیت کے ساتھ نشوونما پائیگا کہ دنیا کسی اور چیز کا نام ہے

پہلے عنوان کے سلسلہ میں شاہ صاحب نے پوری تاریخ اسلام پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ جہاں تک علم ہے، شاہ صاحب پہلے شخص ہیں جسکی نظر تاریخ اسلام اور تاریخ مسلمین کے اصولی فرق اور باریک فرق تک پہنچی اور جس نے تاریخ مسلمین پر تاریخ اسلام کے نقطہ نظر سے نقد و تبصرہ کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ان بہت سی صدیوں میں اسلام قبول کرنے والی اقوام کے درمیان فی الواقع اسلام کا کیا حال رہا ہے۔ یہ ایک ایسا نازک مضمون ہے جسکی پیچیدگیوں میں پہلے ہی لوگ الجھے رہے ہیں اور اب تک الجھے ہوئے ہیں، چنانچہ شاہ صاحب کے بعد بھی کوئی ایسا صاحب نظر نہ اٹھا جسکے ذہن میں حقیقی تاریخ اسلام کا تاریخ مسلمین سے الگ، کوئی واضح تصور ہوتا۔ شاہ صاحب کے کلام میں مختلف مقامات پر اس کے متعلق اشارات موجود ہیں مگر خصوصیت کے ساتھ ازالہ الخفا کی فصل ششم میں انہوں نے صفحہ ۱۲۲ سے صفحہ ۱۵۸ تک مسلسل تاریخ مسلمین پر تبصرہ کیا ہے، اور کمال یہ کیا ہے کہ ایک ایک دور کی خصوصیات اور ایک ایک زمانہ کے فتنوں کو بیان کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان پیشینگوئیوں کو بھی نقل کرتے گئے ہیں جن میں ان حالات کی طرف صریح اشارات پائے جاتے ہیں۔ اس تبصرہ میں قریب قریب ان تمام جاہلی آمیزشوں کی نشان دہی ہو گئی ہے جو مسلمانوں کے عقائد، افکار، علوم، اخلاق، تمدن اور سیاست میں ہوتی رہیں۔

پھر شاہ صاحب نے خرابیوں کے اس ہجوم میں کھوج لگا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان میں بنیادی خرابیاں کونسی ہیں جن سے باقی تمام خرابیوں کا شجرہ نسب ملتا ہو، اور آخر کار دو چیزوں پر انگلی رکھ دی ہے۔ ایک اقتدار سیاسی کا خلافت سے پادشاہی کی طرف انتقال، دوسرے روح اجنبی کا مروہ ہو جانا اور تقلید جاہل کا دماغوں پر مسلط ہو جانا۔

پہلی خرابی پر انہوں نے ازالہ میں پوری تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ خلافت اور پادشاہی کے اصولی و اصطلاحی فرق کو جس قدر واضح صورت میں انہوں نے بیان کیا ہے اور جس طرح احادیث سے اسکی تشریح کی ہے، اسکی کوئی مثال ان سے پہلے کے مصنفین کی تحریروں میں نہیں ملتی۔ اسی طرح اس انقلاب

نقشہ بنانا مشکل ہو گا۔ وہ خواہ کتنا ہی پختہ ایمان لے آئے مگر بہر حال اسکے لیے دین عین اسکی زندگی نہ ہو گا بلکہ زندگی کا ایک ضمیمہ ہی بن کر رہ جائیگا۔

یہ ساری خرابی دینی اور دنیوی علوم کی تقسیم کا نتیجہ ہے اور جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، یہ تقسیم بالکل اسلامی نقطہ نظر کے خلاف ہے۔ نئے نظام تعلیم میں دنیویات کے الگ کورس کی ضرورت نہیں، بلکہ سارے کورس کو دنیویات کے کورس میں تبدیل کر دینا چاہیے۔ شروع ہی سے ایک بچہ کو دنیوی اس طرح روشناس کرایے کہ گویا وہ خدا کی سلطنت میں ہے، اسکے اپنے وجود میں اور تمام آفاق میں خدا کی آیات پھیلی ہوئی ہیں، ہر چیز میں وہ خدا کی حکمت اور قدرت کے آثار دکھ رہا ہے، اس کا اور ہر شے کا براہ راست تعلق خداوند عالم سے ہے جو آسمان سے زمین تک تمام معاملات دنیا کی تدبیر کر رہا ہے، دنیا میں جتنی باتیں اسکو حاصل ہیں اور جو اشیاء اسکے لیے سحر ہیں، سب کی سب خدا نے اسکو دی ہیں، ان سب خدا کی مرضی کے مطابق اور اسکے بتائے ہوئے طریقہ پر اسے کام لینا ہے اور اپنے اس کام کی جواب دہی خدا کے سامنے اس کو کرنی ہے۔

ابتدائی مراحل میں تو کوئی دوسرا نقطہ نظر طالب علم کے سامنے آنا ہی نہیں چاہیے۔ البتہ بعد مراحل میں تمام علوم اسکے سامنے اس طرح آنے چاہیں کہ معلومات کی ترتیب، حقائق کی توجیہ اور واقعات کی تعبیر تو بالکل اسلامی نقطہ نظر سے ہو، مگر اسکے مخالف دوسرے تمام نظریات بھی بوری تنقید و تنقیح کے ساتھ اس حیثیت سے اسکے آگے رکھ دیئے جائیں کہ یہ ضالین اور مغضوب علمیم کے نظریات ہیں۔ اسی طرح عملی زندگی سے تعلق رکھنے والے جملہ علوم کی بنیاد میں تو مقاصد حیات، اصول اخلاق اور مناسج عمل اسلام کے پیوستہ کیے جائیں اور دوسروں کے اصول اور طریقے اس حیثیت سے طالب علم کو پڑھائے جائیں کہ انکی فکری اساس، منزل مقصود اور راہ عمل اسلام سے کتنی اور کس کس پہلو سے مختلف ہے۔ یہ طریقہ ہے تمام علوم کو دینی علوم میں تبدیل کر دینے کا، اور جب اس طریقہ سے تعلیم دی جائے تو ظاہر ہے کہ اس میں دنیویات کے لیے کسی علوہ

کورس کی کوئی حاجت ہی نہیں پیش آسکتی۔

دوسری خصوصیت | دوسری اہم خصوصیت جو اس نظام تعلیمی میں ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ اس میں ہر طالب علم کو مجموعہ علوم بنانے اور تکمیل کے بعد ہر ایک کو "مولانا" اور ہر ایک کو جملہ مسائل میں فتوے کا جواب قرار دے دینے کا وہ طریقہ جو اب تک رائج ہے، ختم کر دیا جائے، اور اسکی جگہ اختصاصی تعلیم کا وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو سالہا سال کے تجربات کے بعد دنیا میں مفید پایا گیا ہے۔ انسان کا علم اب اتنی ترقی کر چکا ہے، اور اتنے شعبے اُس میں پیدا ہو گئے ہیں کہ کسی ایک شخص کا ان سب کو پڑھ لینا محال ہے، اور اگر تمام علوم میں محض معمولی سی شد بوجہ اُسے کرا دی جائے تو وہ کسی شعبہ علم میں بھی کامل نہیں ہو سکتا۔ اسکے بجائے بہتر یہ ہے کہ پہلے آٹھ یا دس سال کا کورس ایسا رکھا جائے کہ ایک بچے کو دنیا اور انسان اور زندگی کے متعلق جتنی معلومات کم سے کم حاصل ہونی ضروری ہیں وہ اسکو خاص اسلامی نقطہ نظر سے دیدی جائیں۔ اسکے ذہن میں کائنات کا وہ تصور بیٹھ جائے جو مسلمان کا تصور ہونا چاہیے، زندگی کا وہ خاکہ جم جائے جو ایک مسلمان کی زندگی ہونی چاہیے، عملی زندگی کے متعلق وہ تمام معلومات اسے حاصل ہو جائیں جنکی ایک آدمی کو ضرورت ہوتی ہے، اور وہ ان سب چیزوں کو ایک سماج کے طریقہ پر برتنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اسے اپنی ذرا ذرا زبان بھی آجائے۔ عربی زبان بھئی اتنی سیکھ لے کہ آگے مزید مطالعہ میں اسے مدد مل سکے۔ اور کسی ایک یورپین زبان سے بھی واقف ہو جائے کہ معلومات کے اُس وسیع ذخیرے سے فائدہ اٹھاسکے جو ان زبانوں میں موجود ہے۔ اسکے بعد اختصاصی تعلیم کے الگ الگ کورس ہوں جن میں چھ یا سات سال کی محققانہ تربیت حاصل کر کے ایک طالب علم اُس شعبہ علم کا ڈاکٹر قرار دیا جائے جسکی تعلیم اس نے حاصل کی ہے۔ مثال کے طور پر میں چند شعبوں اور انکے طریق تعلیم کی تشریح کرونگا جس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ میرے ذہن میں اس اختصاصی تعلیم کا کیا نقشہ ہے۔

ایک شعبہ فلسفہ اور علوم عقلیہ کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔ اس شعبہ میں طالب علم کو پہلے قرآن

کا فلسفہ پڑھایا جائے، تاکہ اس ذریعے سے وہ معلوم کرے کہ انسانی حواس سے جو چیزیں محسوس ہوتی ہیں انکی تہ میں حقائق کی جستجو کرنے کی کیا سبیل ہے، عقل انسانی کی رسائی کہاں تک ہے اور کن حدود وہ محدود ہے، مجرد استدلال پر تخیلات کی عمارت کھڑی کرنے میں انسان کس طرح واقعات اور حقیقت کی دنیا سے الگ ہو کر خیال کی تاریک دنیا میں گم ہو جاتا ہے، مابعد الطبیعی امور کے متعلق کتنا علم انسان کے لیے فی الواقع ضروری ہے، اس ضروری علم تک پہنچنے میں مشاہدہ (observation) اور استقراء (Induction) اور استقراعل

سے کس طرح کام لینا چاہیے، کن امور مابعد الطبیعت کا تعین ہم کر سکتے ہیں، کن کے متعلق ایک محل مطلق حکم سے آگے ہم نہیں بڑھ سکتے، اور کہاں پہنچ کر اجمال کو تفصیل سے بدلنے یا اطلاق کو تقید میں تبدیل کرنے کی کوشش نہ صرف بے بنیاد ہو جاتی ہے بلکہ انسان کو تخیلاتِ لاطائل کی بھول بھلیاں میں بھٹکا دیتی ہے۔ اس بنیاد کو مستحکم کر لینے کے بعد طالب علم کو تاریخِ فلسفہ کا مطالعہ کرایا جائے اور یہاں قرآنی فلسفہ کی مدد سے اسکو تمام مذاہبِ فلسفہ کی سیر کرادی جائے تاکہ وہ خود دیکھ لے کہ حقائق تک پہنچنے کے جو ذرائع انسان کو دیے گئے تھے ان سے کام نہ لے کر یا ان سے غلط طریقہ پر کام لیکر کس طرح انسان بھٹکتا رہا ہے، کس طرح اس نے اوہام کو حقیقت سمجھا اور اس سے کس طرح اسکی زندگی متاثر ہوئی، کس طرح اس نے اپنی پہنچ کر ماوراء چیزوں کے متعلق رجحانِ باغیب حکم لگائے اور اسکے کیا اثرات زندگی پر مترتب ہوئے، کس طرح اس نے اپنے حواس اور اپنی عقل کی حدود کا تعین کیے بغیر ان حقیقتوں کا تعین کرنے میں اپنا وقت ضائع کیا جن کا تعین اسکے بس کی چیز ہی تھا، کہاں ہندو فلسفیوں نے ٹھوکر کھائی، کہاں یونانی فلسفہ بھٹک نکلا، کدھر مسلمان فلاسفہ قرآن کی بتائی ہوئی راہوں سے ہٹ کر نکل گئے، متکلمین کے مختلف اسکولوں نے صدیوں تک جن مسائل پر بحثیں کیں ان میں قرآن کی رہنمائی سے کہاں کہاں اور کتنا کتنا تجاوز تھا، فلسفیانہ تصوف کے مختلف مذاہب نے مجمل کو مفصل اور مطلق کو مقید بنانے کی کس طرح کوششیں کیں اور وہ کس قدر غلط تھیں، یورپ میں فلسفیانہ تفکر نے کیا کیا راہیں اختیار کیں، ایک ہی حقیقت کی جستجو میں کتنے مختلف مذاہب بن گئے، ان مختلف

مذاہب میں حق کتنا ہے اور باطل کی آمیزش کتنی ہوئی اور کن راہوں سے آئی، کون سے مابعد الطبعی تصور ت
ہیں جنہوں نے یورپ میں جڑ پکڑ لی ہے، اُن سے اخلاق و اعمال پر کیا اثرات مترتب ہوئے ہیں اور اگر کتاب اللہ
کی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا جاتا تو فضول و داعی کاوشوں میں وقت ضائع کرنے اور غلط بنیادوں پر زندگی
تعمیر کرنے سے کس طرح دنیا بچ سکتی تھی۔ اس تمام مطالعہ کے بعد طالب علم اپنی تحقیق کے نتائج مرتب کرے،
اور جب اہل علم کی طرح جو تنقید کے بعد وہ اپنا کامل الفن ہونا ثابت کرے تو اس کو فلسفہ میں فضیلت کی سند
دے کر چھوڑ دیا جائے۔

ایک دوسرا شعبہ تاریخ کا ہونا چاہیے جس میں قرآن کا فلسفہ تاریخ، مقصد مطالعہ تاریخ اور طرز
مطالعہ تاریخ طالب علم کے ذہن نشین کرایا جائے تاکہ اس کے قلب سے تمام تعصبات نکل جائیں، وہ حقائق کو
بے رنگ نگاہ سے دیکھنے اور ان سے بے لاگ نتائج اخذ کرنے کے لیے مستعد ہو جائے، انواع انسانی کی
سرگذشت اور تہذیب انسانی کے نشو و ارتقار کا مطالعہ کر کے انسان کی فلاح و خسران اور سعادت
تشتاوت اور عروج و زوال کے مستقل اصول مستنبط کرے، مداخلت ایام بین الناس جس ڈھنگ پر اور
جس ضابطہ کے مطابق ہوتی ہے اسے معلوم کرے، جو اوصاف انسان کو اوپر اٹھاتے ہیں اور جو اسے نیچے
گرادیتے ہیں اُن سے واقف ہوا اور خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرے کہ کس طرح فطرت کا ایک خط مستقیم
ابتدا سے آج تک سیدھا کھینچا ہوا نظر آتا ہے جو انسان کی ترقی کا اصلی راستہ ہے، اُس خط سے ہٹ کر
جو بھی دائیں یا بائیں جانب دور نکل گیا اسے یا تو تھپڑ کھا کر اسی کی طرف پلٹنا پڑا اور نہ ایسا پھینکا گیا کہ پھر
اس کا کچھ پتہ نشان نہ ملے۔ اس طرز مطالعہ سے جب طالب علم کو معلوم ہو جائیگا کہ خدا کا قانون کس قدر بے
لاگ ہے، اور کیسی غیر جانبداری کے ساتھ اس نے قوموں سے معاملہ کیا ہے، تو کوئی قوم بھی نہ اسکی چاہیتی
رہیگی اور نہ کسی کے خلاف اسکے دل میں نفسانی عداوت کا جذبہ رہیگا۔ جس قوم کے کارنامے پر بھی وہ نظر
ڈالے گا بے لاگ طریقے سے ڈالیگا اور فلاح و خسران کے ابدی اصولوں کی کسوٹی پر کس کرکھرے کو الگ اور

کھوٹے کو الگ کر کے سامنے رکھ دینگا۔ اس تربیت ذہنی کے بعد سے تاریخی دستاویزوں، اور آثار قدیمہ اور آفاذِ اہلیہ سے بطور خود واقعات معلوم کرنے اور بطور خود نتائج اخذ کرنے کی مشق کرائی جائے، اور اتنا تیار کر دیا جا کر وہ جاہلی مورخین کے چڑھائے ہوئے لہجوں سے اصل حقائق کو الگ کر کے خود بے لاگ رائیں قائم کر سکے۔

ایک اور شعبہ علوم عمران (social sciences) کا ہونا چاہیے، جس میں پہلے قرآن اور حدیث سے تمدن انسانی کے بنیادی اصول بتائے جائیں۔ پھر تفصیل کے ساتھ اصول سے فروع کا استنباط کر کے اور انبیاء کی رہنمائی میں جمہور بنے تھے ان کے نظائر سے استشاد کرتے ہوئے یہ بتایا جا کر ان قواعدِ اہلیہ (fundamental principles) پر کس طرح ایک صالح نظامِ معاشرت، نظامِ معیشت، نظامِ سیاست، تدبیرِ مملکت، اور تعلقات بین الاقوام کی عمارت اٹھتی ہے۔ پھر یہ بتایا جائے کہ کس طرح انہی اصولوں پر اس عمارت کی مزید توسیع ہو سکتی ہے اور اجتہاد سے توسیع کا نقشہ مرتب کر لیا گیا ہے، اور انسانی علم کی ترقی سے جو نئی قوتیں دریافت ہوتی ہیں اور تمدن کے فطری نشوونما سے جو نئے طرزِ عمل پیدا ہوتے ہیں ان سب کو اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اس صالح تمدن میں جذب کرنے اور اپنے اپنے ٹھیک مقام پر رکھنے کی کیا صورت ہے۔ اسکے ساتھ ایک طرف طالبِ علم کو پھیلی قوموں اور مسلمانوں کی تمدنی تاریخ کا مطالعہ کرایا جائے تاکہ وہ دیکھے کہ تمدن ان اساسی اصول اور اپنی حدود کے قریب رہنے، اور ان کے انحراف کرنے سے کیا نتائج رونما ہوئے ہیں۔ اور دوسری طرف اسے دورِ جدید سیاسی، معاشی، اجتماعی نظریات و عملیات کا تنقیدی مطالعہ کرایا جائے تاکہ وہ یہ بھی دیکھ لے کہ انسان نے اپنی ہدایت بے نیاز بن کر بطور خود اپنی زندگی کے لیے جو راستے تجویز کیے ہیں وہ کہاں تک اس کے لیے موجب سعادت یا شقاوت ہیں۔

سائنس کی مختلف شاخوں کے لیے چند شعبے علیحدہ ہونے چاہئیں جن میں قرآن کی رہنمائی

سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف انبک کی جمع شدہ سائنٹفک معلومات کا جائزہ لیا جائے بلکہ آثارِ فطرت کے مزید مشاہدہ اور قوانینِ فطرت کی مزید دریافت کا کام بھی اپنی خطوط پر کیا جائے جو قرآن نے کھینچ دیے ہیں۔ اگرچہ یہ کتاب سائنس کی کتاب نہیں ہے نہ اسکے موضوع کا براہِ راست سائنس سے کوئی تعلق ہے، لیکن چونکہ یہ اسی مصنف کی تصنیف ہے جس نے کائنات کو تصنیف کیا ہے اور وہ مصنف اپنی ایک کتاب سے دوسری کتاب میں جگہ جگہ استدلال و استشہاد کا کام لیتا ہے، اس لیے اسکے گہرے مطالعہ سے سائنس کے ایک طالب علم کو نہ صرف نظامِ کائنات کا بنیادی فارمولہ معلوم ہو جاتا ہے، بلکہ قریب قریب ہر شعبہ علم میں اسے ایک صحیح نقطہ آغاز (Starting point) اور تلاش و تجسس کے لیے ایک صحیح رخ (Direction) بھی ملتا ہے۔ یہ وہ شاہ کلید (Master key) ہے جس سے سائنس کی ہر گتھی باسانی حل کی جاسکتی ہے، جس سے تحقیق کا سیدھا راستہ صاف کھل جاتا ہے، جسکی مشکل کشائی سے اگر آدمی کام لے تو اس کا بہت سا وقت گتھیوں کو سلجھانے اور سلجھاتے سلجھاتے خود الجھ جانے میں ضائع نہ ہوگا۔ موجودہ سائنس کی گمراہی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ وہ حقائق و اقدار کے مشاہدے کی حد تک ٹھیک رہتا ہے، مگر جب ان حقائق کو جوڑ کر ان نظریات بنا تا ہے تو کائناتِ فطرت کے مبداء و غایت کے واقف ہونے کے باعث ٹھوکر میں کھانا چلا جاتا ہے، اور اس سے نہ صرف بہت سی انسانی قوتِ فضول ضائع ہوتی ہے بلکہ ان غلط نظریات کو جب انسانی تمدن میں جذب کر کے عملیات کی بنیاد اٹھائی جاتی ہے تو وہ فسادِ تمدن کی موجب ثابت ہوتی ہے۔ قرآن کی رہنمائی میں جب ایک مسلم سائنٹسٹ ثابت شدہ حقائق کو نظریات سے الگ کر کے مرتب کرے گا اور مزید حقائق دریافت کر کے ان سے بہتر نظریات و نتائج نکال کر بتائے گا تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا ان سائنٹفک گمراہیوں کو چھوڑنے پر مجبور نہ ہو جائے جن میں آج وہ مبتلا ہے۔

جن علوم کو اس وقت علومِ دینی کہا جاتا ہے ان کے لیے بھی الگ شعبے مخصوص ہونے چاہئیں۔

مثلاً ایک شعبہ قرآن کے تحقیقی مطالعہ کا ہو جس میں پچھلے مفسرین کے کام کا جائزہ لینے کے بعد آگے مزید کام کیا جائے۔ مختلف پہلوؤں سے قرآن کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کی جائے اور علوم انسانی کے تمام شعبوں سے استفادہ کر کے قرآن میں روز افزوں بصیرت حاصل کی جائے۔ اسی طرح ایک شعبہ علوم حدیث کا ہونا چاہیے جس میں قدیم محدثین کے کام سے پورا استفادہ کرنے کے بعد حدیث میں تحقیق، تنقید، ترتیب معلومات اور اخذ نتائج کا مزید کام کیا جائے، اور سعادت کے متعلق زیادہ سے زیادہ تفصیلاً ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالی جائیں، اور ان سے وہ نتائج اخذ کیے جائیں جو اب تک ہمارے علم سے مخفی ہیں۔ ایک شعبہ قانون کا ہونا چاہیے جس میں قرآن کے احکام، حدیث نبوی کی قوی عملی تشریحات، صحابہ کرام اور تابعین کے اجتہادات، اور ائمہ مجتہدین کے طرز استنباط اور جزئیات میں انکی تفریحات کا مفصل تحقیقی مطالعہ کیا جائے، نیز دنیا کی دوسری پرانی اور نئی قوموں کے قوانین اور قانونی نظامات پر بھی گہری نظر رکھی جائے، اور زندگی کے روز بہ روز نئے نئے مسائل و معاملات پر اصول قانون اسلامی کو منطبق کر کے فقہ کے ان چشموں کو پھر سے رواں کیا جائے جو صدیوں سے سوک کر رہ گئے ہیں۔ یہ شعبہ نہ صرف بجا خود بہت عظیم الشان کام انجام دینگے، بلکہ دوسرے تمام شعبوں کو بھی کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے متعلق اپنی سے وہ مواد ملیگا جسکی بنیاد پر علم کی تمام راہوں میں تحقیق و اکتشاف کا کام چلایا جائیگا۔

تیسری خصوصیت میں نے چند شعبے محض تمبیلاً بیان کیے ہیں جن سے پورے نقشے کی تفصیلاً کا ایک تصور باسانی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اب میں اسے نظام تعلیمی کی آخری مگر نہایت اہم خصوصیت کا ذکر کرونگا، اور وہ یہ ہے کہ اس میں وہ بے مقصد تعلیم نہیں ہوگی جو آج کل ہندوستان میں دی جا رہی ہے، بلکہ اس میں تعلیم دینے والے اور تعلیم پانے والے دونوں کے سامنے ایک متعین اور واضح مقصد زندگی اور مہتممائی سچی عمل ہوگا، یعنی یہ کہ ان سب کو مسلک خدا پرستی کی امامت دنیا میں قائم کرنے کے لیے جہاد کبیر کرنا ہے۔ یہ مقصد اس نظام کی ہر چیز میں اسی طرح کام کرے گا جس طرح انسانی جسم کی ہر رگ اور ہر ریشہ اور ہر حرکت میں اسکی روح کام کرتی ہے۔ طلبہ کی شخصی زندگی، ان کے باہمی اجتماعات، ان کے کھیل کود اور تفریحات، اور ان کے در

تدریس اور مطالعہ و تحقیق کے تمام مشاغل میں اسی مقصد کی کار فرمائی ہوگی، اسی کے مطابق انکی سیرت و کردار کی تعمیر کی جائیگی، اسی پر انکے اخلاق ڈھالے جائیں گے، اور تمام ماحول ایسا بنایا جائیگا کہ ہر شخص کو ایک مجاہد فی سبیل اللہ میں تبدیل کر دے۔

منوع نتائج | اس قسم کی تربیت اور اس قسم کی تعلیم پا کر جو لوگ تیار ہونگے ان میں یہ طاقت ہوگی کہ وہ محتاط کی رفتار بدل دیں۔ انکی محققانہ تنقید، جاہلیت کے علوم اور جاہلی تہذیب کی ساری بنیادوں کو ہلا دے گی انکے مدون کیسے ہوئے علوم میں اتنا زور ہوگا کہ جو لوگ آج جاہلیت کے نقطہ نظر پر جمے ہوئے ہیں ان کو وہ اسلامی نقطہ نظر کی طرف پھیر لائیں گے۔ ان کی تحقیق کے نتائج یورپ اور امریکہ اور جاپان تک کو متاثر کر دیں گے اور ہر طرف سے معقول انسان انکے نظریات کی طرف کھینچتے چلے آئیں گے۔ ان کا مرتب کیا نظریہ حیات اور لائو زندگی اتنی قوت کے ساتھ فکر و نظر کی دنیا پر چھا جائیگا کہ عمل کی دنیا میں اسکے خلاف کسی دوسرے لائو کا چلنا مشکل ہوگا۔ پھر اسی تعلیم سے اس سیرت اور اس عزم کے لوگ پیدا ہونگے جو امامت کے نظام میں عملاً انقلاب برپا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ وہ اس انقلاب کے فن کو بھی جانتے ہونگے، ان میں اسکے برپا کرنے کا مضبوط داعیہ بھی ہوگا، اور انہیں اپنی انقلابی تحریک کو خالص اسلامی راہوں پر چلانا بھی آتا ہوگا۔ پھر انہی میں یہ اہلیت بھی ہوگی کہ کامیابی کی منزل پر پہنچ کر اسلامی اصول کے مطابق ایک اسٹیٹ ایک مکمل نظام تمدن کے ساتھ بنا کھڑا کریں جسکی شکل اور روح اسلامی ہو اور جو دنیا میں امامت کرنے کی پوری طاقت و صلاحیت رکھتا ہو۔

عملی مشکلات | حضرات! اس مرحلہ پر پہنچ کر تین کٹھن سوالات سامنے آتے ہیں اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے یہ معروضات سننے کے دوران ہی میں ان سوالات نے آپ کے دلوں میں خلش پیدا کرنی شروع کر دی ہوگی۔

نصاب اور معلمین کی تیاری | پہلا سوال یہ ہے کہ یہ نیا نظام قائم کیسے کیا جاسکتا ہے جبکہ اس نئے طرز پر

نہ تو پڑھانے والے ہی اس وقت کہیں مل سکتے ہیں اور نہ ایسی کتابیں ہی موجود ہیں جن سے کسی ایک شعبہ علم کی تعلیم بھی اس نقشہ کے مطابق دی جاسکے، بلکہ شاید مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ پہلی جماعت کے بچے کو بھی اس طرز کی تعلیم دینے کے لیے کسی مدرس اور کسی کتاب ملنا اس وقت مشکل ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جس طرح ایک نئی عمارت بنانے کے لیے بھٹہ تیار کرنا پڑتا ہے تاکہ انیٹیس پکائی جائیں اسی طرح ایک نیا نظام تعلیم بنانے کے لیے بھی ایک تربیت گاہ بنانا ضروری ہے تاکہ اس میں وہ آدمی تیار کیے جائیں جو اس خاص طریقہ کی تعلیم دینے کے قابل ہوں۔ انیٹیس بھی تو آپ کو پکی پکائی نہیں ملتیں۔ پکانی پڑتی ہیں۔ آدمی بھی آپ کو بنے بنائے نہیں ملیں گے۔ بنانے پڑیں گے۔ اسی ناقص تعلیم سے کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی فارغ ہو کر نکلے ہیں جو فطرت ابراہیمی پر پیدا ہوئے ہیں۔ مگر تعلیم و تربیت کے سارے مرحلوں سے گزرنے کے باوجود اپنا ایمان بچا لائے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر اور مقصد زندگی اسلامی ہے یا ذرا سی محنت سے خالص اسلامی بنایا جاسکتا ہے۔ ان میں یہ طاقت بھی موجود ہے کہ جس مقصد پر وہ ایمان لائے ہیں اسکی راہ میں جفاکشی کر سکیں۔ ان میں اجتہاد کی صلاحیتیں بھی موجود ہیں۔ ایسے لوگوں کو لیکر اگر خاص قسم کی ذہنی و اخلاقی تربیت دی جائے، اور ملوٹا جس ترتیب سے اُنکے ذہن میں اب تک جمع ہوتی رہی ہیں اُسکو ذرا حکمت کے ساتھ بدل دیا جائے، اور زادیہ نگاہ اچھی طرح اسلام کی سمت میں جما دیا جائے، تو یہی لوگ تحقیق و مطالعہ سے اس قابل ہو سکتے ہیں کہ علوم کو میرے بیان کردہ نقشہ کے مطابق از سر نو مدون کرنا شروع کر دیں۔ پھر حسب تدوین علوم کا کام کسی حد تک انجام پا جائے تو ایک نمونہ کی درس گاہ ابتدائی تجربوں کے لیے بنائی جاسکتی ہے، اور بعد میں آہستہ آہستہ اسے ترقی دیکر یونیورسٹی کے مرتبہ تک پہنچایا جاسکتا ہے۔

متعلمین کی فراہمی | دوسرا سوال یہ ہے کہ اس قسم کا نظام تعلیم اگر قائم بھی کر دیا جائے تو اس میں جاؤ بیت کوئی ہوگی جو پڑھنے والوں کو اسکی طرف کھینچے گی؟ جو نظام تعلیم موجودہ نظامات تمدن و سیاست کی خدمت

کے لیے نہیں بلکہ ان سے لڑنے کے لیے بنایا جائے اس میں شریک ہونے کو یہ تو امید ہو ہی نہیں
 سکتی کہ کل ڈوہاں سے نکل کر کچھ کما کھا ئیگا، پھر کتنے ایسے لوگ ہونگے جو کمانے سے بے نیاز ہو کر اس
 تعلیم کو حاصل کرنے کے لیے آئینگے جسکے بعد نیوی لحاظ سے کوئی شاندار مستقبل نہیں ہے؟ اس کا جواب
 یہ ہے کہ اس نظام تعلیم میں حق اور صداقت کے سوا کوئی کشش نہیں ہے اور کسی دوسری کشش کی جست
 بھی نہیں۔ جن لوگوں کے لیے اس چیز میں جاؤ بیت نہ ہو اور صرف روٹی ہی جنکو کھینچ سکتی ہو انکی توجہ فرمائی
 سے یہ نظام تعلیم خود بھی اتنا ہی بے نیاز ہوگا جتنے وہ اس سے بے نیاز ہیں۔ اسکے لیے تو وہ لوگ دکا
 ہیں جو جان بوجھ کر اس مقصد اور اس کام کے لیے اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی وقف کرنے پر تیار ہوں
 جسکے لیے یہ نظام تعلیم بنایا جائیگا۔ اور ایسے لوگ بالکل ہی مفقود نہیں ہیں۔ تمام ہندوستان سے
 کیا پچاس بچے بھی ہر سال اس کام کے لیے نمل سکیں گے؟ اگر اتنے بچے بھی وہ قوم فراہم نہیں کر سکتی
 جو مدتوں سے اسلام اسلام چن رہی ہے تب بھی کچھ پروا نہیں۔ اللہ دوسری قوموں کو یہ سعادت
 بخشے گا۔

مال کا سوال | تیسرا اور آخری سوال یہ ہے کہ اس کام کے لیے مال کہاں سے آئیگا؟ اس کا مختصر سا
 جواب یہ ہے کہ ان لوگوں کے پاس سے جو مال اور ایمان دونوں رکھتے ہوں اور اتنی عقل بھی رکھتے
 ہوں کہ اپنے مال کا صحیح مصرف سمجھ سکیں۔ ایسے لوگ بھی اگر اس قوم میں نہ پائے گئے جو رات دن
 اسلام کے درو میں تڑپ رہی ہے تو میں پھر یہی کہوں گا کہ کچھ پروا نہیں، اللہ دوسری قوموں میں سے
 ایسے آدمی پیدا کریگا۔ آخر پہلے بھی تو کفر و شرک ہی کی گود سے وہ اللہ کے بندے نکل کر آئے تھے
 جسکی مالی قربانیوں سے دنیا میں اسلام کا فروغ ہوا۔